سرمایہ داری سے مقابلے کی ضرورت

ڈاکٹر سید ذیشان ارشد

عہد نو برق ہے آتش زن ہر خرمن ہے
ایمن اس سے کوئی صحرا نہ کوئی گلشن ہے
اس نئی آگ کا اقوام کہن ایندھن ہے
ملت ختم رسلؐ شعلہ بہ پیراہن ہے
آج بھی ہو جو ابراہیم کا ایمان پیدا
آگ کر سکتی ہے انداز گلستان پیدا

(علامہ اقبالؒ)

تحفظِ دین اور غلبۂ دین کی جدوجہد: ایک ناگزیر فریضہ

اوپر اشعار شاعرِ مشرق علامہ محمد اقبالؒ کی نظم "جواب شکوہ" سے ماخوذ ہیں جو دورِ حاضر کے حالات پر گہرا فکری تبصرہ پیش کر رہے ہیں۔

آج دنیائے اسلام چہار جانب سے حملوں کی زد میں ہے۔ فلسطین، کشمیر، افغانستان، عراق، شام، چیچنیا، سنکیانگ اور میانمار- ہر خطے میں مسلمان مظلومیت کا شکار ہیں، لاکھوں شہید کیے جا چکے ہیں۔ مسلم حکمران استعمار کے آلۂ کار بن چکے ہیں، اور اسلامی معاشرے کو باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت زوال کی طرف دھکیلا جا رہا ہے۔ فحاشی، عریانی، مادہ پرستی اور دہریت کی یلغار اسلامی اقدار و روایات کو مسخ کر رہی ہے۔ اسلامی فکر کو سیکولر، جاہلی تناظر میں محدود کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے، اور ایک عام مسلمان کے لیے رزقِ حلال کا حصول بھی دن بہ دن دشوار تر ہوتا جا رہا ہے۔

'اسلام خطرے میں ہے' اب محض ایک جذباتی نعرہ نہیں رہا، بلکہ یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت

بن چکا ہے۔

برصغیر میں ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی (جو برطانوی استعماری تسلط کے خلاف ایک فیصلہ کن مگر ناکام جدوجہد تھی) کی شکست کے بعد، علماء نے تحفظِ دین کے لیے جو حکمتِ عملی اپنائی، وہ اپنی نوعیت میں منفرد اور دوررس اثرات کی حامل تھی۔ اس سے دین کی علمی، روحانی اور ثقافتی بقاء ممکن ہوئی۔ یہی پالیسی آج بھی ہمارے لیے ایک مضبوط بنیاد فراہم کرتی ہے تاکہ ہم اپنی تہذیبی شناخت کو غیر اسلامی ثقافتی یلغار سے محفوظ رکھ سکیں۔ اسی پائیدار علمی و روحانی مزاحمت کی بدولت اسلام آج تک دہری و مغربی نظام میں مکمل طور پر ضم نہیں ہو سکا۔ دشمن اس حقیقت سے پوری طرح آگاہ ہے اور اسی لیے اسلام کو اپنا سب سے بڑا چیلنج سمجھتا ہے۔

بدقسمتی سے، دشمن اب بڑی حد تک کامیاب ہوتا نظر آرہا ہے۔ اسلامی علمیت اور روحانیت کو مدارس، مساجد اور خانقاہوں تک محدود کر دیا گیا ہے، جبکہ تعلیمی و ریاستی نظام کو اس انداز سے ڈھالا گیا ہے کہ وہ اسلامی اصولوں کو ناقابلِ عمل اور دقیانوسی قرار دیتا ہے۔ اس کے نتیجے میں مسلمان اپنی انفرادی، اجتماعی اور ریاستی زندگی میں اسلام سے رہنمائی لینے کی بجائے دہری فکری نظام کو علم کا اصل معیار سمجھنے لگا ہے۔

اگر ہم نے اسلامی علم و فکر کو صرف انفرادی عبادات اور روحانی مشاغل تک محدود رکھا، تو ہمارا انجام بھی دیگر مذاہب جیسا ہوگا، اور اسلام ایک فعال تہذیب کی بجائے، محض ایک ثقافتی مظہر بن کر رہ جائے گا۔

ان تمام حقائق سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ اب ہمیں محض دفاعی حکمت عملی پر قناعت نہیں کرنی چاہیے، بلکہ ایک منظم اقدامی پالیسی اپنانی ہوگی، جس میں تحفظِ دین اور غلبۂ دین کی جدوجہد کو باہم مربوط کیا جائے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ وَلَوْ

كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ۔ (سورۃ التوبہ ۹:۳۳، سورۃ الصف ۶۱:۹، سورۃ الفتح ۴۸:۲۸)

تحفظِ دین اور غلبۂ دین کی تحریک کو جوڑنا ہر مخلص اہلِ ایمان کی ذمہ داری ہے - چاہے وہ علماء ہوں، صوفیاء ہوں، مبلغین، مصلحین، مجاہدین یا انقلابی کارکن۔

اس اتحاد کی دو بنیادی وجوہات ہیں:

۱۔ اگر غلبۂ دین کی تحریک، تحفظِ دین سے کٹی ہو تو وہ محض ایک نعرہ بن کر رہ جاتی ہے اور لازماً ناکامی کا شکار ہو گی۔ یعنی اگر غلبۂ دین کے نام پر چلائی جانے والی کوئی تحریک دین کی اصل روح، علمی اساس اور روحانی ورثے کے تحفظ سے جڑی نہ ہو، تو وہ محض جذباتی نعرہ بازی تک محدود ہو جائے گی۔ ایسی تحریکیں جلد وقتی جوش میں دم توڑ دیتی ہیں کیونکہ ان کے پاس نہ فکری گہرائی ہوتی ہے نہ اخلاقی استحکام۔ وہ عوام کو وقتی طور پر متوجہ تو کر سکتی ہیں، مگر دیرپا تبدیلی یا تہذیبی انقلاب نہیں لا سکتیں۔

۲۔ اگر تحفظِ دین کی کوشش، غلبۂ دین سے مربوط نہ ہو تو دشمن اسے ایک بے ضرر پراجیکٹ بنا کر اسلامی فکر کو دہری نظام میں ضم کرنے میں کامیاب ہو جائے گا۔ یعنی اگر دین کے علمی، روحانی یا ثقافتی تحفظ کی کاوشیں غلبۂ دین کے عملی مشن سے الگ رہیں، تو دشمن انہیں ایک غیر مؤثر اور "غیر خطرناک" سرگرمی سمجھ کر برداشت کر لے گا۔ پھر وہ بتدریج ان کوششوں کو اپنے نظام میں جذب کر لے گا۔ یوں "تحفظِ دین" کی یہ سرگرمیاں صرف رسمی یا ثقافتی علامتیں بن جائیں گی، جو دہری (سیکولر) نظام کو چیلنج کرنے کے بجائے، اس کے اندر جذب ہو کر اس کی تائید کرنے لگیں گی۔

دورِ حاضر میں غلبۂ دین کی تحریک کے دو مرکزی اصول یہ ہیں:

۱۔ اسلام ایک مکمل، خود کفیل نظامِ حیات ہے، جو زندگی کے ہر پہلو میں رہنمائی فراہم کرتا ہے اور کسی بیرونی فکری یا تہذیبی سہارے کا محتاج نہیں۔ اس تصور کی اصولی بنیاد شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے اپنی گراں قدر تصانیف حجۃ اللہ البالغہ اور ازالۃ الخفاء میں رکھی، جہاں انہوں نے اسلامی شریعت کو ایک جامع تمدنی و تہذیبی نظام کے طور پر پیش کیا، جو نہ صرف فرد بلکہ

معاشرہ اور ریاست کے لیے بھی الٰہی ہدایت فراہم کرتا ہے۔

۲۔ سرمایہ داری، دورِ جدید کی جاہلیتِ خالصہ ہے، جو اسلامی اقدار سے صریح طور پر متصادم ہے اور انسان کو رب العالمین کے مقام پر فائز کرنے کی جسارت کرتی ہے۔ اس فکری تنقید کو دورِ جدید میں مؤثر انداز میں اجاگر کرنے کا کارنامہ مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ نے سرانجام دیا جنھوں نے اپنی تحریر "تجدید و احیائے دین" کے تحت سرمایہ دارانہ تہذیب کی فکری جڑوں پر تنقید کرتے ہوئے اسلامی نظامِ حیات کو ایک مکمل اور متبادل ماڈل کے طور پر پیش کیا۔

یہ دونوں اصول محض نظری بیانات نہیں بلکہ وہ بنیادیں ہیں جن پر عصرِ حاضر میں تحفظ اور غلبۂ دین کی تحریک کو استوار کیا جانا چاہیے۔ اگر ہم نے اسلام کو محض ذاتی عقائد یا چند مذہبی رسوم تک محدود رکھا اور سرمایہ دارانہ نظام کو ایک "غیر متعلق" حقیقت سمجھا تو نہ ہم دین کا حقیقی تحفظ کر سکیں گے اور نہ اس کے غلبے کی جدوجہد کو مؤثر بنا پائیں گے۔

لہٰذا اب وقت آ چکا ہے کہ ہم سرمایہ داری کو صرف ایک معاشی نظریہ نہیں بلکہ ایک ہمہ گیر تہذیبی اور فکری چیلنج کے طور پر پہچانیں۔ یہی وہ فہم ہے جس کی روشنی میں ہم اس کے عالمی غلبے کو سنجیدگی سے سمجھنے اور چیلنج کرنے کی کوشش کریں گے۔ یہ اگلے حصے کا موضوع ہے جہاں ان دونوں اصولوں کی وضاحت تدریجاً اور تفصیلاً پیش کی جائے گی۔

سرمایہ داری کا عالمی غلبہ

اسلامی غلبۂ دین کی تحریک کا پہلا اصول ہمیں قرآنِ مجید کی متعدد صریح اور غیر مجمل آیات سے حاصل ہوتا ہے، جو اس امر پر زور دیتی ہیں کہ دینِ اسلام نہ صرف واحد برحق دین ہے، بلکہ یہ مکمل طور پر، بغیر کسی فکری یا تہذیبی آمیزش کے، اپنانے کے لائق بھی ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: إِنَّ الدِّينَ عِندَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ

"بیشک اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے" (سورۃ آلِ عمران، ۳:۱۹)

یہ آیت اس بات کو قطعی اور غیر مشروط انداز میں واضح کرتی ہے کہ اللہ کی بارگاہ میں صرف

دینِ اسلام ہی قابلِ قبول ہے۔ باقی تمام فلسفے، نظریات اور مذہبی نظامات الٰہی معیارِ حق سے محروم ہیں۔

ایک اور مقام پر فرمایا:

یَا أَیُّهَا الَّذِینَ آمَنُوا ادْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَافَّةً

"اے ایمان والو! اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ" (سورۃ البقرہ، ۲:۲۰۸)

یہ آیت ایمان والوں کو جزوی اسلام کی نہیں، بلکہ کلی اسلام کی مکمل اور جامع پیروی کی دعوت دیتی ہے۔ اس میں فرد سے لے کر معاشرہ، ریاست، معیشت اور ثقافت تک - زندگی کے ہر شعبے کو اسلامی اصولوں کے تابع بنانے کا تقاضا شامل ہے۔

ان آیات کی روشنی میں یہ بات روزِ روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام محض عقائد کا مجموعہ نہیں بلکہ ایک مکمل نظامِ حیات ہے، جو مابعد الطبیعیاتی (metaphysical) بنیادوں پر روحانی، اخلاقی، سماجی، سیاسی اور تمدنی تشکیل دیتا ہے۔ اس کی فطرت میں مکمل شمولیت اور ہمہ گیریت ہے، نہ کہ جزوی قبولیت یا فکری انضمام۔

اسلام اپنے ماننے والوں سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ اس دین کو بغیر کسی مغربی، سیکولر یا غیر اسلامی فکری و تہذیبی پیوند کے، خالصتاً اللہ کی بندگی کے جذبے سے قبول کریں۔ وہ دیگر مذاہب کی مانند اپنی شناخت کسی بیرونی نظام یا تہذیب کے تابع کرنے کا روادار نہیں۔

تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ جب عیسائیت نے پال (Paul) کے ذریعے یونانی، رومی اور نارڈک تہذیبوں سے فکری و فلسفیانہ مصالحت کر کے خود کو ان کے سانچوں میں ڈھالنے کی کوشش کی، تو وہ اپنی اصل توحیدی روح، پیغمبرانہ تعلیم اور اخلاقی مرکزیت کھو بیٹھی۔ بعد ازاں یہ مذہب رفتہ رفتہ سرمایہ دارانہ نظام کا آلہ کار بن گیا، جس نے عیسائیت کو ثقافتی فریم ورک تک محدود کر کے اصل دینی مقاصد سے جدا کر دیا۔

اسی طرح ہندومت، جو کبھی روحانی ریاضت، ترکِ دنیا اور مراقبہ کی علامت تھا، اب سنگھ پریوار جیسے گروہوں کی قیادت میں سرمایہ دارانہ قوم پرستی کی شکل اختیار کر چکا ہے۔

ہندومت کی روحانی بنیادیں بتدریج ایک عسکری، ثقافتی اور سیاسی قوم پرستی کے نظریے میں تبدیل ہو چکی ہیں، جہاں مذہب کا مقصد افراد کو اعلیٰ انسانی اقدار کی طرف بلانے کے بجائے صرف ایک خاص قسم کے قومی مفادات کی برتری قائم رکھنا بن چکا ہے۔

اسلام اس انجام سے محفوظ رہنے پر اصرار کرتا ہے کہ وہ نہ صرف اپنی الگ دینی اور تہذیبی شناخت کا تحفظ کرے بلکہ دنیا میں حق کے غلبے کا داعیہ بھی ساتھ رکھے۔ وہ کسی دوسرے فکری، ریاستی یا تہذیبی تسلط کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں - نہ فکری سطح پر، نہ تمدنی، نہ سیاسی یا معاشی میدان میں۔

اسلامی غلبۂ دین کی تحریک کا دوسرا اصول ہماری علمی و سیاسی تاریخ میں اجنبی رہا ہے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں سرمایہ داری نامی نظام موجود ہی نہ تھا۔ سرمایہ دارانہ طرزِ فکر اور نظامِ زندگی نے چودھویں صدی عیسوی میں یورپ کے مخصوص شہروں (اٹلی اور ولندیز) میں جنم لیا اور مسلم دنیا میں یہ نظام اٹھارھویں و انیسویں صدی میں داخل ہوا۔

ہم سرمایہ داری کو جاہلیتِ خالصہ کہتے ہیں۔ جاہلیت خالصہ اس علمیت اور عملیت (praxis) کا نام ہے جو اللہ تعالیٰ کے وجود اور فعالیت کا انکار کرتے ہوئے انسان یا انسانیت کو رب، خالق، قدیم اور قادرِ مطلق تسلیم کرتی ہے۔ اس جاہلیت کا نظریاتی نعرہ یہ ہے:

[نَعُوذُ بِاللہ] لا الٰہ الا الانسان

یہی سرمایہ داری کا اصل کلمہ ہے۔ انسانی تاریخ میں کوئی اور نظامِ فکر اس شدت اور خلوص سے اس عقیدے پر قائم نہیں رہا۔ یہ شرک سے بھی بڑھ کر ہے۔

ماضی میں انسانیت کو مخلوط جاہلیتوں کا سامنا تھا (جیسے عیسائیت و یہودیت) جو اگرچہ شرک کی مرتکب تھیں، مگر اللہ کی ربوبیت و قدامت کا انکار نہ کرتی تھیں۔ مگر سرمایہ داری، جاہلیتِ خالصہ کی پہلی اور اب تک کی واحد مثال ہے جو اللہ تعالیٰ کے تمام اوصاف کی قطعی نفی کرتی ہے۔

آج کی دنیا پر اسی جاہلیتِ خالصہ کا غلبہ ہے۔ سرمایہ داری نے ایک مخصوص انفرادیت،

معاشرت، ثقافت اور ریاست کی شکل اختیار کی ہے جو پوری دنیا میں نافذ ہو چکی ہے۔ اس نے صرف تہذیبوں کو زیر نہیں کیا بلکہ ان کے نظامِ فکر کو بھی جزوی یا کلی طور پر معطل کر دیا ہے۔ اسلام کے سوا تمام مذاہب اس کے سانچے میں ڈھل چکے ہیں۔

اب اسلام کا اصل حریف نہ عیسائیت ہے، نہ یہودیت، نہ ہندومت۔ آج کا سب سے بڑا چیلنج سرمایہ دارانہ نظامِ زندگی ہے، کیونکہ باقی تمام مذاہب اس کے آلہ کار بن چکے ہیں۔ انہوں نے سرمایہ دارانہ علمیت کو "حق"، سرمایہ دارانہ روحانیت کو "قلبی واردات" اور سرمایہ دارانہ ریاست کو "معاشرتی ناگزیر حقیقت" مان لیا ہے۔

دیکھو انہیں جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو

ایسے میں، اگر اسلامی تحریکیں اپنی جدوجہد کو یہودیت، عیسائیت یا ہندومت کے مقابلے تک محدود رکھیں تو خطرہ ہے کہ وہ خود بھی انہی کی طرح سرمایہ دارانہ نظام میں جذب ہو جائیں گی۔ پھر ہم بھی اسلامی عقلیت، روحانیت اور عملیت کی محض مذہبی توجیہات بیان کرنے لگیں گے - اور غلبۂ دین کی جدوجہد بے معنی ہو جائے گی۔

یہ بات بھی واضح رہے کہ:

"سرمایہ داری جاہلیتِ خالصہ ہے"، مغرب نہیں۔

یورپ کی معلوم تاریخ تین سے ساڑھے تین ہزار سال پر محیط ہے۔ سرمایہ داری کا ظہور چودھویں صدی میں ہوا اور اس کا مکمل غلبہ اٹھارھویں اور انیسویں صدی میں مستحکم ہوا۔ اس سے قبل یورپ میں فطرت پرستی، بت پرستی اور عیسائیت جیسی مخلوط جاہلیتیں غالب تھیں۔

لہٰذا کوئی وجہ نہیں کہ یہ غلبہ ابدی ہو۔ مستقبل میں یورپ اسلام قبول کر سکتا ہے، جیسے ماضی میں دیگر اقوام نے کیا۔

سترھویں صدی سے آج تک سرمایہ داری کا دائرہ مسلسل بڑھتا رہا ہے اور اب یہ امریکہ، روس، چین، جاپان، بھارت اور تقریباً تمام لاطینی امریکی ممالک سمیت دنیا کے بیشتر غیر یورپی

خطوں پر بھی غالب ہے۔ اس لیے یہ کہنا درست ہوگا کہ:

"جاہلیتِ خالصہ" (یعنی سرمایہ داری) جتنی یورپی ہے، اتنی ہی چینی، جاپانی، کوریائی اور لاطینی امریکی بھی ہے۔

اس انسانی پرستی کی بنیاد مسلم دنیا میں معتزلہ تحریک (عمومی معنوں میں عقل پرستی کی تحریک نہ کہ متعین کلامی مذہب) نے نویں اور دسویں صدی میں رکھ دی تھی۔ اگر امام غزالیؒ، شیخ عبد القادر جیلانیؒ اور امام ابن تیمیہؒ وغیرھم اس تحریک کو جڑ سے اکھاڑ نہ پھینکتے، تو ممکن تھا کہ جاہلیتِ خالصہ سب سے پہلے مسلم دنیا ہی میں جنم لیتی۔ بد قسمتی سے، آج معتزلہ فکر کے جدید وارث مسلم دنیا میں سرمایہ دارانہ جاہلیتِ خالصہ کے غلبے کو مضبوط کر رہے ہیں۔

سرمایہ دارانہ نظام اور طرزِ حیات

مسلم دنیا میں آج سرمایہ دارانہ طرزِ زندگی اور نظامِ حیات غالب آچکا ہے، مگر افسوس کہ نہ صرف عام مسلمان بلکہ علماء و صوفیاء کی ایک بڑی تعداد بھی اس حقیقت کا شعور نہیں رکھتی۔ ہم سرمایہ داری کو ایک مکمل، منظم اور مربوط نظام کے طور پر پہچاننے سے قاصر ہیں۔ ہمارے علماء آج بھی صرف سرمایہ دارانہ طرز کے انفرادی اعمال یا معاہدوں (جیسے ووٹنگ، حصص کی خرید و فروخت، یا مدارس میں سائنسی تعلیم کے اجرا) پر شرعی احکام کا اطلاق کرتے ہیں لیکن سرمایہ دارانہ نظام پر مجموعی طور پر حکم نہیں لگاتے اور انفرادی اعمال یا معاہدوں کو سرمایہ نظام کے سیاق میں رکھ کر حکم نہیں لگاتے۔ یہ فتاویٰ دینے کا ایک روایتی طریقہ ہے، لیکن ہمیں اس طریقہ کار کی تاریخی بنیادوں کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔

یہ طریقہ اس دور میں رائج ہوا جب اسلامی ریاست قائم تھی، سلطان ظلِ الٰہی شریعت کا تابع تھا، اور تمام اجتماعی و ریاستی فیصلے علومِ اسلامی کی روشنی میں کیے جاتے تھے۔ ایسے میں انفرادی اعمال پر ان کے نظاماتی اثرات کو نظر انداز کر دینا قابلِ فہم تھا۔ لیکن جب سے استعماری قوتوں نے مسلم دنیا پر قبضہ کیا، صورتِ حال مکمل طور پر بدل گئی۔

پاکستان ایک خالص سرمایہ دارانہ ریاست ہے۔ یہاں سلطانِ وقت کا کوئی اسلامی تصور موجود

نہیں، نہ ہی شریعت نافذ ہے۔ اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات محض کاغذی دستاویزات بن کر رہ گئی ہیں۔ حکمران طبقہ علومِ اسلامی سے یکسر بے خبر ہے، اور تمام فیصلے مغربی سوشل سائنسز اور سائنسی علمیت کی بنیاد پر کیے جاتے ہیں، جن کا مقصد صرف سرمایہ دارانہ مقاصد کا حصول ہوتا ہے، نہ کہ شریعت کے مقاصد کا۔

اس تناظر میں جب ہم انفرادی سرمایہ دارانہ عمل یا پالیسی پر شرعی حکم لگاتے ہیں، بغیر یہ دیکھے کہ اس پالیسی یا انفرادی عمل کا سرمایہ داری کے نظاماتی غلبے کے تناظر میں کیا اثر ہو رہا ہے، تو ہم ناخواستہ اسلامی معاشرت، فکر، اور نظامِ حکمرانی کو سرمایہ دارانہ سانچے میں ضم کرنے کے مرتکب ہو رہے ہیں۔

اسلام کو سرمایہ دارانہ نظام میں ضم کرنے کے اس رویے کو ترمیم پسندی کہا جاتا ہے۔ اس کے سب سے مہلک نتائج ہمیں اسلامی بینکاری میں نظر آتے ہیں جہاں بعض علماء نے سرمایہ دارانہ معاہدوں کو "اسلامی" جواز فراہم کر دیا ہے۔ نتیجتاً غیر مسلم بھی اسلامی بینک کھول رہے ہیں اور ہر سال مسلمانوں کے کھربوں ڈالر ان ہی اداروں کے ذریعے سودی وسٹہ کے بازاروں میں جھونک دیے جاتے ہیں۔

یہی سب سے بڑا خطرہ ہے: کہ اسلام بھی رفتہ رفتہ دیگر مذاہب کی طرح سرمایہ دارانہ نظام میں ضم ہو جائے اور اپنی شناخت کھو دے۔ اس خطرے کا مقابلہ کرنے کے لیے سب سے پہلا قدم یہ ہے کہ مسلمان، خصوصاً علماء اور صوفیاء، سرمایہ دارانہ نظام کی ماہیت اور اس کے اجزائے ترکیبی کو اچھی طرح سمجھیں۔

مولانا محمد پکتھال، ایک انگریز مسلمان مفسرِ قرآن نے سرمایہ کو "تکاثر" کا مترادف قرار دیا ہے اور اس کا انگریزی ترجمہ rivalry in worldly increase کیا ہے یعنی دنیاوی مال و دولت کے حصول کی ہوس میں ایک دوسرے پر سبقت کی کوشش۔

سرمایہ داری دراصل حرص و حسد کا نظام ہے، جس میں فرد، معاشرہ اور ریاست، سب کے سب اس جدوجہد میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔ سرمایہ دارانہ تعقل (rationality) کا تقاضا

ہے کہ دولت کا واحد معقول استعمال اس کی مستقل بڑھوتری میں ہے۔ یہی استحصال ہے۔ اس نظام میں دولت خود غرضی، حرص، اور حسد کی علامت بن جاتی ہے۔

سرمایہ دار ہونا کسی خاص معاشی مقام کا نام نہیں۔ کوئی مزدور، کسان، سرکاری ملازم یا ماہرِ فن اگر حرص اور حسد کی بنیاد پر زندگی گزار رہا ہے، تو وہ بھی سرمایہ دار ہے۔ اس کے برعکس حضرت عثمان غنیؓ، حضرت عبد الرحمٰن بن عوفؓ، یا تحریکِ خلافت کے سرکردہ رہنما سیٹھ چھوٹانی جیسے مال دار حضرات سرمایہ دار نہ تھے، کیونکہ ان کی دولت دین کی خدمت اور جہاد میں صرف ہوتی تھی۔

سرمایہ داری کا غلبہ تین سطحوں پر ہوتا ہے: فرد، معاشرہ، اور ریاست۔ فرد اپنی زندگی کے بیشتر فیصلے حرص کی بنیاد پر کرنے لگتا ہے اور موت کو بھول کر عبد الدینار بن جاتا ہے۔ سرمایہ دارانہ معاشرت کو سول سوسائٹی کہا جاتا ہے، جو مذہبی معاشرت کے برعکس، محض اغراض پر مبنی تعلقات پر قائم ہوتی ہے۔ اس کا مرکز مسجد یا خانقاہ نہیں، بلکہ مارکیٹ ہے۔

ریاست کی سطح پر سرمایہ دارانہ ریاست کو ریپبلک کہا جاتا ہے، یعنی عوام کی حکومت۔ لیکن یہ عوام وہی ہیومن بینگز ہوتے ہیں جو سرمایہ دارانہ عقلیت کے قائل اور حرص و حسد کے بندے ہوتے ہیں۔ یہ ریاست ایسے ہی افراد کے حقوق کو ہیومن رائٹس کے نام پر تسلیم کرتی ہے، جن سے سرمایہ بڑھانے کے مقاصد پورے ہو سکیں۔

سرمایہ داری ایک مکمل نظامِ حیات ہے، نہ کہ محض معاشی نظریہ۔ اس کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ یہ تدریجاً انفرادیت، معاشرت اور ریاست کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔ اسی کو کلیت پسندی totalizing کہتے ہیں — یعنی ہر میدانِ زندگی کو اپنی گرفت میں لینا۔

سرمایہ داری کا تاریخی آغاز چودھویں و پندرھویں صدی میں یورپ کے چند شہروں سے ہوا، اور اس کے پرجوش پرچارک اکثر یہودی تھے، جو یورپی معاشروں میں حقارت کا نشانہ بنے۔ لیکن دو بڑی تبدیلیوں نے سرمایہ داری کو فروغ دیا:

ا۔ کیتھولک چرچ کے خلاف بغاوت — مارٹن لوتھر اور اس کے ساتھیوں نے چرچ کے اجارہ داری کے خلاف آواز بلند کی، اور رفتہ رفتہ شمالی یورپ میں قومی ریاستوں اور قومی چرچز کا قیام عمل میں آیا۔

۲۔ استعماریت — پندرھویں صدی سے یورپی اقوام نے پوری دنیا میں قتل، لوٹ مار، اور وسائل کی چوری کا بازار گرم کیا۔ امریکہ میں لاکھوں ریڈ انڈینز قتل کیے گئے، اور آج تک ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ میں امریکی و یورپی عسکری و معاشی مداخلت جاری ہے۔

یہ تمام استعماری مظالم یورپی و امریکی معاشروں کے لیے دولت، طاقت اور نظریاتی برتری کا سبب بنے، اور اسی نے سرمایہ دارانہ روحانیت و عقلیت کو وہاں غالب کر دیا۔

آج، سرمایہ داری کا تسلط عالمی ہے۔ میڈیا، انٹرنیٹ، عالمی مالیاتی ادارے، اور بین الاقوامی قانون سازی سب اس کے خادم بن چکے ہیں۔ ان حالات میں سرمایہ داری سے مقابلہ کرنا ایک پیچیدہ، مگر ناگزیر کام ہے، جو دانش، صبر اور طویل المدت حکمتِ عملی کا تقاضا کرتا ہے۔

سرمایہ داری سے مقابلے کا طریقہ کار

سرمایہ دارانہ نظام سے مؤثر طور پر نبرد آزما ہونے کے لیے دو بنیادی حقائق کا ادراک ضروری ہے:

ا۔ سرمایہ دارانہ غلبہ ہمہ گیر (totalizing) ہے — یعنی یہ نظام صرف معیشت تک محدود نہیں بلکہ انفرادیت، معاشرت اور ریاست کے تمام پہلوؤں پر غالب آ چکا ہے۔

۲۔ اس نظام کو اس کی حدود کے باہر سے توڑنا ممکن نہیں (کیونکہ اسکا کوئی خارج ہے نہیں)؛ اسے صرف اس کے اندر سے ہی چیلنج کیا جا سکتا ہے۔

انیسویں صدی میں علماء اور صوفیاء نے دفاعی حکمتِ عملی اختیار کی جس سے دین کا علمی و روحانی اثاثہ کسی حد تک محفوظ رہا۔ لیکن ریاست، معیشت اور معاشرت کی سطح پر سرمایہ داری کا غلبہ کمزور ہونے کے بجائے مضبوط سے مضبوط تر ہوتا گیا۔

جہادی تحریکوں نے اگرچہ وقتاً فوقتاً سرمایہ دارانہ طاقتوں کو چیلنج کیا، مگر یہ جدوجہد زیادہ تر نظام

کے کناروں تک محدود رہی۔ سرمایہ داری کے مراکز - یعنی معیشت، سیاست، اور ثقافت کے مراکز - ان مزاحمتوں سے بڑی حد تک محفوظ رہے۔ مزید بر آں، مجاہدین کو مسلم عوام کی وسیع تائید بھی حاصل نہ ہو سکی، جس کی بنا پر یہ تحریکیں عمومی اسلامی مزاحمت کی شکل اختیار نہ کر سکیں۔

یہی کیفیت دنیا بھر کی دوسری انقلابی تحریکوں کی بھی رہی - چاہے وہ بولیویا، کولمبیا، سری لنکا یا ہندوستان کی نکسل باڑی تحریک ہو۔ یا پھر چین، موزمبیق، ویتنام وغیرہ کی کمیونسٹ تحریکیں، جنہیں آخر کار سرمایہ داری نے یا تو جذب کر لیا یا وہ زوال کا شکار ہو گئیں۔

لٰہذا، سرمایہ داری کا حقیقی مقابلہ اس کے اندر سے، اس کے تضادات کو گہرا اور نمایاں کر کے کیا جا سکتا ہے۔ موجودہ دور میں سرمایہ دارانہ نظام پانچ بڑے ہمہ گیر بحرانوں کا شکار ہے:

- ماحولیاتی بحران (Environmental crisis)
- مالیاتی بحران (Financial crisis)
- ریاستی بحران (State governance crisis)
- روحانی و نفسیاتی بحران (Spiritual/Psychological crisis)
- صحت کا عالمی بحران (Global Health crisis)

یہ سب بحران نظاماتی نوعیت کے ہیں۔ جہاں کہیں بھی سرمایہ داری کا غلبہ ہے، وہاں یہ بحران کسی نہ کسی درجے میں موجود ہیں۔ ہمیں چاہیے کہ ان بحرانوں سے متعلق شعور پیدا کریں، ان کے پس منظر میں موجود سرمایہ دارانہ نظام کی جڑوں کو بے نقاب کریں، اور ان کا متبادل اسلامی حل پیش کریں۔ ہم نے باب دہم میں اس مقصد کے لیے ایک اسلامی حکمتِ عملی مرتب کرنے کی کوشش کی ہے، جو (پاکستانی تناظر میں) سرمایہ داری کے داخلی تضادات کو نشانہ بناتی ہے۔ یہاں ان پانچوں بحرانوں کی مختصر وضاحت پیش کی جا رہی ہے:

۱۔ ماحولیاتی بحران (Environmental crisis)

ماہرین ارضیات اور حیاتیات کے مطابق، زمین ایک نئے جیولوجیکل دور میں داخل ہو چکی ہے

جسے Anthropocene کہا جاتا ہے (یعنی وہ دور جس میں انسان زمین کے ماحول پر فیصلہ کن اثر ڈال رہا ہے)۔ اس سے پہلے تقریباً پانچ لاکھ سال تک زمین Holocene دور میں تھی۔

سرمایہ دارانہ نظام نے کوئلہ، تیل، گیس اور دیگر قدرتی وسائل کو جس بے رحمی سے استعمال کیا ہے، اس نے فطری توازن کو شدید متاثر کیا ہے۔ اگر موجودہ انداز میں عالمی درجہ حرارت میں مزید ۳ ڈگری اضافہ ہوا، تو دنیا کے کئی ساحلی شہر اور جزائر (جیسے کراچی، جنوبی سندھ، بنگلہ دیش، مالدیپ) زیرِ آب آسکتے ہیں۔ یہ بحران دراصل سرمایہ داری کی سائنس پرستی اور تصرف فی الارض کی غیر محدود خواہش کا نتیجہ ہے۔ سائنس کو نیوٹن نے کائنات پر انسانی ارادے کی بالادستی کا ذریعہ قرار دیا تھا۔ آج وہی سائنس انسانی بقا کے لیے خطرہ بن گئی ہے۔

اس بحران کا حل دو ممکنہ راستوں میں ہے:

۱. مذہبی بیداری اور فطرت سے ہم آہنگ زندگی کا فروغ، جو سرمایہ دارانہ ترقی کے تصور کو مسترد کرے۔

۲. ایسی ٹیکنالوجی کی تخلیق جو سرمایہ داری کو برقرار رکھتے ہوئے ماحول کے بگاڑ کو روکے (یہ راستہ سرمایہ دارانہ مفکرین اپنائے ہوئے ہیں)۔

اسلامی تحریکوں کے لیے یہ بحران ایک اہم موقع ہے، بشرطیکہ وہ مذہبی بیداری کا ایسا ماڈل پیش کریں جو انسانی بقاء کو حرص وحسد کے خلاف جدوجہد سے جوڑ دے۔

۲۔ مالیاتی بحران (Financial crisis)

فنانس (Finance) سرمایہ داری کا خاصہ ہے۔ غیر سرمایہ دارانہ نظام میں "دولت" ہوتی ہے، مگر "فنانس" نہیں۔ فنانس وہ زر ہے جو محض منافع کی خاطر، سٹہ بازی، سودی قرض اور قیاسی مالیاتی معاہدوں کی شکل میں، مسلسل گردش میں رہتا ہے۔ سرمایہ دارانہ فنانس کا سب سے بڑا خطرہ یہ ہے کہ یہ دولت بغیر کسی مادی اساس (جیسے سونا یا چاندی) کے پیدا کی جاتی ہے۔ ریاست اور بینک جتنا چاہیں زر تخلیق کر سکتے ہیں، جو قرضے کی صورت میں مارکیٹ میں

آتا ہے۔

جب قرضوں کی ادائیگی رک جاتی ہے، تو بحران آتا ہے، جیسے ۲۰۰۷–۲۰۱۰ کا عالمی مالیاتی بحران (Subprime Mortgage Crisis)، جس میں امریکا و یورپ میں بڑے پیمانے پر بیروزگاری اور معاشی گراوٹ پیدا ہوئی۔ اگر ان بحرانوں سے فائدہ اٹھا کر ایک متبادل اسلامی مالیاتی نظام قائم کیا جائے، تو سرمایہ داری کو اندر سے کمزور کیا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ کام صرف مربوط، بیدار اور منصوبہ بند تحریک ہی کر سکتی ہے۔

۳۔ ریاستی بحران (State governance crisis)

سرمایہ دارانہ نظام کا آخری سہارا ”ریاست“ ہے یعنی وہ تنظیمی ڈھانچہ جو سرمایہ، محنت، وسائل اور قوانین کو ایک نظام کے تحت رکھتا ہے۔ مگر گلوبلائزیشن کے عمل نے قومی ریاستوں کی خودمختاری کو شدید زک پہنچائی ہے۔ چونکہ آج سرمایہ، اشیاء، معلومات اور ٹیکنالوجی بین الاقوامی سطح پر برق رفتاری سے منتقل ہوتے ہیں، اس لیے کوئی بھی قومی حکومت مجموعی طور پر معیشت کی سمت طے کرنے کی قدرت نہیں رکھتی۔ سرمایہ دارانہ ریاست اس دوہری ذمہ داری کا شکار ہو گئی ہے کہ وہ ایک طرف قومی مفادات کی حفاظت کرے اور دوسری طرف عالمی سرمایہ کے تقاضے بھی پورے کرے۔

اس کشمکش کا مظہر ہمیں سب سے واضح طور پر ڈونلڈ ٹرمپ کی انتظامیہ کی پالیسیوں میں نظر آیا۔ ٹرمپ نے عالمی سرمایہ داری کے اس تصور کو چیلنج کیا جس کے تحت امریکہ خود کو ایک ”عالمی سرمایہ دارانہ ریاست“ کے طور پر پیش کرتا تھا—یعنی ایسا نگران جو عالمی سرمایہ کے مفادات کی نگرانی کرے، چاہے اس کے نتیجے میں امریکی قومی مفادات کو وقتی طور پر قربان بھی کرنا پڑے۔

ٹرمپ نے اس عالمی کردار سے پیچھے ہٹتے ہوئے "America First" کا نعرہ لگایا اور کئی عالمی اداروں سے علیحدگی یا مخالفت کا اعلان کیا:

- چین کے خلاف تجارتی جنگ چھیڑی جس میں اربوں ڈالر کے درآمدی محصولات

(tariffs) عائد کیے گئے، اور عالمی سپلائی چین کو نقصان پہنچا۔

- World Health Organization (WHO) پر جانبداری کا الزام لگا کر اس سے علیحدگی اختیار کی، خاص طور پر COVID-۱۹ کے دوران۔
- NATO جیسے عسکری اتحاد کو بوجھ قرار دیا اور اس کے رکن ممالک سے فوجی اخراجات میں اضافے کا مطالبہ کیا۔
- اقوامِ متحدہ اور ماحولیاتی معاہدات (مثلاً Paris Climate Accord) سے علیحدگی اختیار کی یا ان پر عمل درآمد روک دیا۔

یہ تمام پالیسیاں اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ امریکہ عالمی سطح پر سرمایہ داری کے "نگہبان" کے طور پر کامیابی سے اپنا کردار ادا کرنے میں ناکام رہا ہے، اور بالآخر ایک قومی مفاد پرست، قوم پرستانہ ریاست میں سمٹنے پر مجبور ہوا۔

یہ رجحان صرف امریکہ تک محدود نہیں رہا۔ یورپ، بھارت، برازیل اور دیگر کئی ممالک میں بھی قوم پرستانہ تحریکیں ابھر رہی ہیں، جو ریاست کو عالمی سرمایہ کی غلامی سے نکالنے کی بات تو کرتی ہیں، لیکن عملاً وہی سرمایہ دارانہ اہداف ایک نئی جمالیات کے ساتھ پیش کرتی ہیں۔

اسلامی تحریکوں کے لیے یہ ایک سنہری موقع ہے کہ وہ سرمایہ دارانہ ریاست کے اس فکری بحران سے فائدہ اٹھا کر ایک نیا ریاستی تصوّر پیش کریں — جو اللہ کی حاکمیت، عدلِ اجتماعی، اور مقاصدِ شریعت پر مبنی ہو، اور جو نہ صرف عالمی سرمایہ داری کی مزاحمت کر سکے بلکہ ایک عملی متبادل بھی فراہم کرے۔

۴۔ نفسی اور روحانی بحران (Spiritual/Psychological crisis)

پہلی جنگِ عظیم کے بعد مغرب میں انسان اور کائنات کے بارے میں یقین، استحکام اور معنویت کا شدید بحران پیدا ہوا۔ صدیوں پر محیط مذہبی روایت کے زوال اور سرمایہ دارانہ ترقی کے سائنسی و صنعتی جبر نے انسان کو ایک مشینی پرزے کی حیثیت دے دی۔ اس بحران کا نتیجہ وجودی خلاء کی صورت میں نکلا، جہاں فرد اپنی شناخت، مقصدِ حیات اور اخلاقی بنیادوں

سے محروم ہو گیا۔

اسی تناظر میں پوسٹ ماڈرنزم Postmodernism جیسی فکری تحریکیں ابھریں جنہوں نے سرمایہ دارانہ اقدار—یعنی آزادی، مساوات اور ترقی—کو خود مغرب کے اندر ہی چیلنج کرنا شروع کیا۔ انہوں نے ان نظریات کو لغو، مبہم اور ناقابلِ حصول قرار دیا، کیونکہ یہ اقدار محض نعروں تک محدود رہیں اور عملی طور پر صرف چند طبقوں کو فائدہ پہنچا سکیں۔ ان تحریکوں نے انسانی شعور میں یہ سوالات پیدا کیے کہ: اگر سب کچھ نسبتی (relative) ہے، تو پھر زندگی کی کوئی حتمی معنویت یا مقصد کیسے ہو سکتا ہے؟

آج مغربی فرد دو انتہاؤں کا شکار ہے: ایک طرف وہ سرمایہ داری کے نتیجے میں پیدا ہونے والی بے راہ روی، اباحیت، ذہنی خلفشار (schizophrenia)، بے معنویت اور لذت پرستی میں ڈوبا ہوا ہے؛ دوسری طرف وہ روحانی سچائی کی شدید پیاس بھی محسوس کرتا ہے—ایسی پیاس جو سرمایہ دارانہ نظام کی مادی فکر اور اس کی شیطانی روحانیت کبھی بجھا نہیں سکتی۔

یہی روحانی پیاس اسلام کے پیغام کو مغرب اور بھارت میں پرکشش بنا رہی ہے، جہاں ہزاروں افراد اسلام قبول کر رہے ہیں۔ مگر افسوس کی بات یہ ہے کہ نو مسلم حضرات بھی ایک مربوط اسلامی نظام کی عدم موجودگی کی وجہ سے بالآخر اسی سرمایہ دارانہ نظام میں ضم ہو جاتے ہیں، جس کے خلاف وہ نظریاتی طور پر بغاوت کر چکے ہوتے ہیں۔

سرمایہ دارانہ نظام نے اس تضاد کو جمالیاتی چمک کے ذریعے چھپا رکھا ہے—یعنی میڈیا، فیشن، تفریح، اور اشتہارات کے ذریعے سرمایہ داری کو نہ صرف معمول بلکہ "خوبصورت اور مثالی طرزِ زندگی" کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ یہی اس نظام کی سب سے بڑی چالاکی ہے: وہ اپنی معنویت کے بحران کو خوبصورتی، تفریح اور فردیت کے پیکج میں لپیٹ کر انسان کو روحانی زوال کے باوجود لذت اور خوش فہمی کے سراب میں محصور رکھتا ہے۔

۵۔ صحت کا عالمی بحران (Global Health Crisis)

سرمایہ دارانہ نظام کا ایک اور مہلک اور ابھر کر سامنے آنے والا بحران صحت کا عالمی بحران

ہے، جو نہ صرف فرد کی بقاء بلکہ پوری انسانی نسل کے لیے خطرہ بنتا جارہا ہے۔ اس بحران کی جڑیں سرمایہ دارانہ صنعتی پیداوار، منافع پر مبنی طبی ماڈل، اور دوا ساز کمپنیوں کی لالچ پر مبنی پالیسیوں میں پیوست ہیں۔

سرمایہ دارانہ نظام میں صحت کو ایک انسانی حق کی بجائے ایک تجارتی صنعت کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔ دوا ساز کمپنیاں (Big Pharma) نئی دوا کی تیاری میں اس وقت تک سرمایہ کاری نہیں کرتیں جب تک اسے بڑے پیمانے پر منافع کا ذریعہ نہ بنایا جاسکے۔ اس کے نتیجے میں غریب اور ترقی پذیر ممالک کے عوام مہنگی ادویات، بنیادی طبی سہولیات، اور ویکسین تک رسائی سے محروم رہتے ہیں۔

اس منافع پرستی نے دنیا کو Antimicrobial Resistance (AMR) جیسے مہلک خطرے سے دوچار کر دیا ہے۔ بار بار اور بے جا اینٹی بایوٹکس کے استعمال، اور ان کے غیر معیاری اور نیم مؤثر نعم البدل کی دستیابی نے بیکٹیریا اور وائرسز کو ان ادویات کے خلاف مزاحمت سکھادی ہے۔ اب ایسی بیماریاں جن کا علاج ماضی میں ممکن تھا، وہ دوبارہ مہلک ہوتی جارہی ہیں۔

اسی نظام نے SARS، COVID-19، اور دیگر وبائی امراض کو جنم دینے یا کم از کم ان کے تیز تر پھیلاؤ میں کردار ادا کیا۔ جنگلات کی کٹائی، حیاتیاتی نظام کی بربادی، اور غیر فطری صنعتی فارمینگ نے وائرسز کو جانوروں سے انسانوں میں منتقل ہونے کے مواقع فراہم کیے۔ جب یہ بیماریاں پھیلیں، تو صحت کی عالمی پالیسیوں کا محور عوامی بھلائی نہیں بلکہ ویکسینز اور علاج کی مارکیٹنگ بن گیا۔ ویکسین کی تقسیم میں عالمی سطح پر غیر مساوات دیکھنے کو ملی جس نے سرمایہ داری کے "صحت بھی ایک جنس ہے" والے رویے کو بے نقاب کر دیا۔

یہ بحران صرف جسمانی بیماری تک محدود نہیں، بلکہ ذہنی صحت، غذائی قلت، اور ناقص ماحولیاتی حالات کی شکل میں بھی ظاہر ہوتا ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام نہ تو صحت کو فطری نعمت کے طور پر تسلیم کرتا ہے، نہ ہی اس کی مساوی تقسیم کو ممکن بناتا ہے۔

نتیجہ: یہ تجزیہ واضح کرتا ہے کہ سرمایہ داری اپنے اندر گہرے تضادات رکھتی ہے۔ ان تضادات کو شدید کرنا اور ان سے فائدہ اٹھا کر ایک دینی متبادل پیش کرنا ایک تاریخی ضرورت ہے۔ سرمایہ داری کے انہدام کے لیے دو شرائط لازم ہیں:

۱۔ ایسی مذہبی تحریک جو سرمایہ دارانہ عقائد، اقدار اور طرزِ زندگی کو مکمل طور پر رد کرے، اور اس میں جذب نہ ہو۔

۲۔ وہ تحریک سرمایہ دارانہ نظام کو اندر سے سمجھتی ہو، اس کے تضادات کو گھمبیر کرنے کی حکمت عملی رکھتی ہو اور صبر و استقامت کے ساتھ اس پر مسلسل کام کرتی رہے۔

اگلی نشست میں ہم سرمایہ دارانہ نظام کے فکری ماخذات کا تجزیہ کریں گے، ان شاء اللہ۔